فقہ حنفی میں اختلاف رائے کی روایت: تجزیاتی مطالعہ (آغاز تا ۸۰۰ ہجری)

حافظ محمد مشتاق*

Abstract

In Islamic law, there are certain issues that have been decided once and for all. There can be no further discussion or religious ruling on them. However, there are many other additional matters that have not b een clearly decided in the Holy *Qur'ān* and Sunnah and have instead been left open to critical discussion and interpretation by Islamic scholars and jurists on the basis of consensus. In such matters, it is natural to have different points of view on the same topic by different scholars during critical discussion. Under the same principle, various issues are explained in Hanfi Fiqh or school of thought. In such matters, the opinions of Islamic scholars and jurists are also considered and given weight age, but only after giving precedence to the Holy *Qur'ān* and Sunnah. However, concrete opinions are given serious consideration in the rest of the matters according to the changing needs and circumstances. This also negates the popular misconception about Hanfi Fiqh that it only promotes blind imitation and copying. On the other hand, fact-based and well-researched opinions are given due importance in the Fiqh Hanfi .There is a long-standing tradition in this Fiqh to have difference of opinion based on the principle of freedom of expression. This tradition is also evolving with the passage of time. All prominent Hanfi jurists have expressed different opinions on certain matters on the basis of their theological research and wisdom. Hanfi Fiqh had started in an environment of tolerance and open discussion and the same tradition still runs strong in this school of thought. This principle started with Imam Abu Hanifa and his disciples and continues to this day in the research of contemporary jurists. However, the present work only focuses on the period between 1st and 10th Hijra.

Keywords: Hanfi Fiqh, Difference of Opinion, Freedom of Expression, Tradition.

---

* گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز)، ایمن آباد، گوجرانوالہ۔

تعارف:

شریعت اسلامیہ بنی نوع انسان کو دائمی اور جامع ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے، جس پر عمل پیرا ہونا ہی فلاح دارین کی ضمانت ہے۔ دین اسلام بنیادی طور پر ایک فطری دین ہے، جو اپنے ماننے والوں کو شرعی احکامات صادر کرتے ہوئے فطری تقاضوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ دین اسلام میں کوئی ایسا امر نہیں ہے جو انسانی طبع کے خلاف ہو اور جس پر عمل کرتے ہوئے کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ اس لیے اس دین کو" دین آسان " کے طور پر پیش کیا گیا ہے، قرآن وسنت میں کوئی ایسا حکم صادر نہیں کیا گیا جو انسانی استطاعت سے ماورا ہو۔ انسان فطری طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہے جو اپنے رنگ و نسل، فہم وفراست، رسوم ورواج اور رہن سہن کے لحاظ سے دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ زمانے کا تغیر اور حالات وواقعات بھی لوگوں کے درمیان اختلافات کا سبب بنتے ہیں۔ اختلاف رائے چونکہ انسان کی فطرت کا لازمی جزو ہے، لہذا دین فطرت میں اس کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ مدلل اور مستحکم رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ قرآن وسنت میں کچھ ایسے احکامات ہیں جو حتمی و قطعی ہیں، جن میں کسی قسم کی اجتہادی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر کچھ دیگر فروعی مسائل ہیں جن میں حتمی فیصلہ انسانی رائے کی بنیاد پر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں جہاں اظہار رائے کی اجازت ہوتی ہے وہاں اختلاف رائے ایک فطری عمل بن جاتا ہے۔ اہل علم کے لیے مستحکم مضبوط دلائل کی بنیاد پر اجتہادی رائے کے اظہار کی اجازت نہ صرف قرآن وسنت میں دی گئی ہے بلکہ اصحاب رسول ﷺ کی زندگیوں سے اس کی عملی مثال نظر آتی ہے۔ انہی اصول و قوانین کو مد نظر رکھتے ہوئے اور عوام الناس کی سہولت کا لحاظ رکھتے ہوئے فقہ حنفی کی بنیاد رکھی گئی جہاں اہل علم مجتہدین فقہاء عقلی و نقلی دلائل کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ یہ اختلافات کسی ذاتی مفاد یا تعصب کی بنیاد پر نہیں بلکہ سراسر علمی و تحقیقی بنیادوں قائم ہیں، جو اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ فقہ حنفی میں تقلید محض کی بجائے اظہار رائے کی آزادی کو ترجیح دی جاتی ہے اور اہل علم کی مدلل آراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اختلاف رائے کی اس روایت کا آغاز امام ابو حنیفہ سے شروع ہوا اور فقہاء احناف کے درمیان یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ فقہ حنفی کے متعلق ایک سوچ یہ بھی پائی جاتی ہے کہ اس میں تقلید محض کی ہی تلقین کی جاتی ہے اور اس میں اہل علم کو اجتہادی آراء کے اظہار کی بھی اجازت نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے اس آرٹیکل میں اس موضوع کا انتخاب کیا ہے تاکہ فقہ حنفی کا حقیقی نکتہ نظر سامنے لایا جائے اور اس پر کیے جانے والے اعتراضات کا قلع قمع کیا جاسکے۔

اختلاف رائے کا شرعی جواز:

قرآن و سنت میں ایسے فروعی مسائل جن کے متعلق حتمی و قطعی اور صریحا فیصلہ نہ کیا گیا ہو وہاں اہل علم مجتہدین عقلی نقلی دلائل کی بنیاد پر اپنی رائے کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے ہیں۔یعنی ایسے مسائل میں انسانی رائے کو اہمیت دی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا"[1] اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس تک دودھ پلائیں یہ اس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے، اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور پہننا دستور کے مطابق بچے کے باپ پر لازم ہے، کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہ دی جائے،(اور) نہ ماں کو اس کے بچے کے باعث نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس اولاد کے سبب سے، اور وارثوں پر بھی یہی حکم عائد ہو گا، پھر اگر ماں باپ دونوں باہمی رضا مندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ اس آیت کی روشنی میں اجتہاد بالرائے کا استدلال کرتے ہوئے امام جصاص اپنی کتاب "الفصول فی الاصول" میں لکھتے ہیں:

فَدَلَّتْ هَذِهِ الْآيَةُ عَلَى جَوَازِ الِاجْتِهَادِ مِنْ وَجْهَيْنِ: أَحَدُهُمَا: قَوْله تَعَالَى: ''وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ''[2] وَالْمَعْرُوفُ إنَّمَا يُوصَلُ إلَيْهِ بِغَالِبِ (الظَّنِّ) وَالرَّأْيِ، إذْ لَيْسَ لَهُ مِقْدَارٌ مَعْلُومٌ مِنْ نَصِّ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَإِجْمَاعِ الْأُمَّةِ، وَإِنَّمَا هِيَ عَلَى قَدْرِ الْحَالِ وَمَا يَحْتَاجُ إلَيْهِ الْمُرْضَعُ وَالْمُرْضِعَةُ. وَالْوَجْهُ الْآخَرُ: قَوْله تَعَالَى: ''فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا''[3] وَلَيْسَ لِمَا يَقَعُ التَّرَاضِي عَلَيْهِ حَدٌّ مَعْلُومٌ عَلَى حَسَبِ مَا يَغْلِبُ فِي الظَّنِّ، لِأَنَّهُ عَلَّقَهُ بِالْمُشَاوَرَةِ، وَالْمُشَاوَرَةُ لَا تَقَعُ فِي شَيْءٍ فِيهِ تَوْقِيفٌ أَوْ اتِّفَاقٌ، أَوْ دَلِيلٌ قَائِمٌ، وَإِنَّمَا هُوَ اسْتِخْرَاجُ رَأْيٍ عَلَى غَالِبِ الظَّنِّ[4]

---

[1] البقرہ:۲۳۳

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] جصاص، احمد بن علی ابو بکر الرازی حنفی، (کویت: وزات الاوقاف، ۱۹۹۴ء)، ۴: ۲۴-۲۵

قرآن کی تفہیم میں اصحاب رسول ﷺ سب سے مقدم ہیں، جنہوں نے نہ صرف قرآن و سنت کی کامل تفہیم حاصل کی بلکہ اس کی عملی تفسیر کا مظاہرہ کیا۔ صحابہ کرام کے درمیان بھی بعض مسائل میں علمی و تحقیقی بنیادوں پر اختلاف رائے پایا جاتا تھا، حتیٰ کہ نبی اکرم ﷺ کے سب سے قریبی صحابی حضرات ابو بکر و عمرؓ کے درمیان کئی مسائل میں اختلافات تھے۔ یہ اختلافات سراسر علمی نوعیت کے تھے ان میں کسی قسم کا تعصب اور ذاتی مفاد کا عنصر شامل نہیں تھا۔ ہر صحابی دوسرے کا بے حد ادب و احترام کرتا اور جب دوسرا اپنی اجتہادی رائے سے مسئلے کا حل پیش کرتا تو اس کا باقاعدہ شکریہ ادا کیا جاتا۔ مثلاً سیدنا ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے مابین اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی جائے یا نہ کی جائے۔ مانعین زکوٰۃ کے بارے حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ جو لوگ کلمہ پڑھتے ہیں ان سے جنگ نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کا فرمان یاد دلایا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، فَمَنْ قَالَ: لاَ إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، فَقَدْ عَصَمَ مِنِّي مَالَهُ وَنَفْسَهُ إِلَّا بِحَقِّهِ، وَحِسَابُهُ عَلَى اللَّهِ"

مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال کرنے کا حکم دیا گیا جب تک وہ "لا الہ الا اللہ" نہ کہہ دیں، پس جس نے ایسا کہہ دیا اس نے اپنا مال اور اپنی جان کو مجھ بچا لیا، مگر اس کا حق اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

اس پر سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا:

وَاللَّهِ لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلاَةِ وَالزَّكَاةِ، فَإِنَّ الزَّكَاةَ حَقُّ المَالِ، وَاللَّهِ لَوْ مَنَعُونِي عَنَاقًا كَانُوا يُؤَدُّونَهَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَى مَنْعِهَا۔[5]

اس کے علاوہ بہت سے مسائل ہیں جن کے متعلق اصحاب رسول ﷺ کے درمیان اختلافات تھے، مثلاً نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ، آپ ﷺ کی تدفین کا مسئلہ، تدوین قرآن کا مسئلہ، مال فے کی تقسیم کا مسئلہ اور زکوۃ کی وصولی کا مسئلہ وغیرہ۔ طوالت سے بچنے کے لیے ان کی تفصیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ صحابہ کرام کے بعد اختلاف رائے کی اس روایت کو ائمہ و مجتہدین نے برقرار رکھا۔ دوسری صدی ہجری میں کئی فقہی

[5] محمد بن اسماعیل بخاری، الجامع الصحیح، **کتاب استتابۃ المرتدین والمعاندین وقتالھم**، باب قتل من ابی قبول الفرائض، (بیروت: دار ابن کثیر، ۱۹۸۷ء)، ۱: ۱۴، حدیث:۲۵

مکاتب فکر معرض وجود میں آئے، جنہوں نے اپنے فقہی نقطہ نظر کے مطابق دین کو سمجھا اور آگے پھیلایا۔ ان فقہی مکاتب میں سے جس فقہ کو اہل علم سے لے کر عام عوام الناس میں قبولیت عامہ نصیب ہوئی وہ فقہی مکتب "فقہ حنفی" کے نام سے منسوب ہے۔ فقہ کی تدوین اور پرورش ایسے خاص علمی و فکری ماحول میں ہوئی جسے امت کے مجتہدین اور اہل علم نے بہت زیادہ سراہا اور اسے اپنانے میں ہی اپنا اور امت کا بھلا سمجھا۔ یہ فقہ آج دنیا کے اکثر علاقوں میں نافذ العمل ہے، ملکی معاملات ہوں یا بین الاقوامی تعلقات، عدالتی نظام کی بات ہو یا پھر معاشی پالیسیاں۔ عمرانی معاہدات ہوں یا پھر سماجی تعلقات، الغرض حقوق اللہ کے مسائل ہوں یا پھر حقوق العباد کی بات ان سب مسائل کے آسان حل کے لیے فقہ حنفی کی طرف ہی رجوع کیا جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی تدوین کا منہج و اسلوب:

فقہ حنفی کی تدوین در حقیقت اس تحقیقی و اجتہادی عمل کی ایک منظم جد وجہد کا نام ہے جس کا آغاز عہد رسالت و صحابہ میں ہو چکا تھا۔ اس فقہ کی

تدوین میں امام ابو حنیفہؒ نے اسی جد وجہد کو اصول و قوانین کی بنیاد پر آگے بڑھایا اور مجتہدین کے لیے ایک راہ ہموار کر دی۔ آپؒ نے ایسے اصول و ضوابط کی بنیاد رکھی جن پر عمل پیرا ہو کر اہل علم نے اس فن کو آج تک زندہ رکھا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل و عناصر جن کی بنیاد پر اس فقہ کی تدوین کا آغاز کیا گیا۔ مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب "سیرت نعمان" میں فقہ حنفی کی تدوین کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام ابو حنیفہؒ سے پہلے اس فن پر کوئی مستقل کام نہیں ہوا تھا، امام صاحب نے جب فقہ کی تدوین کا کام شروع کیا تو بہت زیادہ مسائل ایسے تھے جن کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی تھی، اور نہ ہی صحابہ کرام کا قول موجود تھا۔ اس لیے آپؒ کو قیاس سے کام لینا پڑا اور یہ عمل صحابہ کے دور میں بھی تھا، خود صحابہ کرام قیاس کرتے ہوئے اس کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے۔ اگرچہ صحابہ کے دور میں تمدن کو زیادہ وسعت نہ تھی اس لیے نہ کثرت سے واقعات پیش آئے اور نہ ہی اجتہادی رائے کی زیادہ ضرورت پیش آئی۔ امام ابو حنیفہؒ فقہ کو ایک مستقل فن بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے کثرت سے قیاس کی ضرورت کو محسوس کیا گیا، تاکہ اس کے ساتھ مستقل اصول و قواعد

مرتب کیے جائیں۔ اس بات نے ان کو رائے، قیاس کے انتساب سے زیادہ شہرت ملی، اسی لیے ان کو امام الرائے کہا جاتا ہے۔[6]

فقہ حنفی کی تدوین میں کون سا منہج اختیار کیا گیا ہے اس کی وضاحت خود امام ابو حنیفہؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

آخذ بكتاب الله، فما لم أجد فبسنة رَسُول الله، فإن لم أجد في كتاب الله ولا سنة رَسُول الله، أخذت بقول أصحابه، آخذ بقول من شئت منهم، وأدع من شئت منهم، ولا أخرج من قولهم إلى قول غيرهم، فَأَمَّا إِذَا انتهى الأمر، أَوْ جاء إلى إِبْرَاهِيم، وَالشَّعْبِيّ، وابن سيرين، وَالحَسَن، وعطاء، وَسَعِيد بن المسيب، وعدد رجالا، فقوم اجتهدوا فأجتهد كما اجتهدوا[7]

اسی طرح شاہ ولی اللہ امام ابو حنیفہؒ کے طریق تدوین فقہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

سئل أبو حنيفة رحمه الله تعالى إذا قلت قولا وكتاب الله يخالفه قال اتركوا قولي بكتاب الله فقيل إذا كان خبر الرسول صلى الله عليه و سلم يخالفه قال اتركوا قولي بخبر رسول الله صلى الله عليه و سلم فقيل إذا كان قول الصحابة يخالفه قال اتركوا قولي بقول الصحابة۔ [8]

امام موفق بن احمد المکی امام ابو حنیفہؒ کے تدوین فقہ کا طریق کار بتاتے ہوئے امام صاحب کا قول نقل کرتے ہیں:

"اذا وجدت الامر فی کتا ب الله تعالیٰ او فی سنت رسول الله ﷺ اخذت به ولم اصرف عنه۔ اذا اختلف الصحابه اخترت من قولهم واذا جاء من بعد هم اخذت ترکت۔[9]

ان اقوال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی تدوین میں سب سے پہلے قرآن وسنت کو بنیاد بنایا، اس کے بعد اقوال صحابہ کو ترجیح دی، اس کے بعد بھی اگر کسی مسئلہ کا حل نہ ملا تو پھر اجتہادی رائے کا اظہار کیا۔ گویا فقہ حنفی میں اظہار رائے کی اجازت اس وقت دی گئی ہے جہاں کوئی دلیل نص سے نہ مل رہی ہو۔ اپنی رائے کے مقابلے میں امام صاحب ہمیشہ حدیث رسول ﷺ کو ترجیح دیتے تھے۔

---

6 شبلی نعمانی، **سیرت نعمان**، (لاہور: اردو بازار اسلامی کتب خانہ، ت،ن)، ۱۰۱

7 ابو بکر احمد بن علی بغدادی، **تاریخ بغداد**، (بیروت: دار الغرب الإسلامي، ۲۰۰۲ء)، ۱۵: ۵۲۰

8 احمد بن عبد الرحیم، شاہ ولی اللہ، **عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید**، (قاہرۃ: المطبعة السلفية، ت،ن)، ۲۲

9 موفق بن احمد الحنفی، **مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ**، (مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ، ۱۳۲۱ھ)، ۸۰

فقہ حنفی کی تدوین میں امام صاحب نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی رائے ہی حتمی ہو گی اور میری رائے کے مقابلے میں کوئی اور رائے پیش نہ کی جائے بلکہ آپ نے ہمیشہ مدلل اور مضبوط رائے کو ترجیح دی خواہ وہ آپ کے مؤقف کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ فقہ حنفی کی تدوین ہی جب ایسے ماحول میں ہوئی ہو جہاں اہل علم کو اظہار رائے کی اجازت دی گئی ہو اور شخصیت کی بجائے مدلل رائے کو ترجیح دی جاتی رہی ہو، ایسے فقہ پر تقلید محض کا الزام لگانا درست بات نہیں۔

امام ابو حنیفہ اور آپ کے تلامذہ کے درمیان اختلاف رائے:

فقہ حنفی میں امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زفرؒ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جن کی باہمی مشاورت کے نتیجے میں فقہ حنفی کی بنیاد رکھی گئی۔ امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی تدوین میں اپنے شاگردوں کو نہ صرف مشاورتی عمل میں شامل کیا بلکہ ان کی آراء کو فقہ کی تدوین شامل کیا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فقہ حنفی میں امام ابو حنیفہ کے تلامذہ کو عقلی و نقلی دلائل کی بنیاد پر اپنی آراء کے اظہار کی مکمل آزادی تھی، جس کی وجہ سے بہت سے مسائل میں انہوں اپنے استاد امام ابو حنیفہ سے اختلاف رائے کیا ہے۔ امام صاحب کے شاگردوں نے مسائل کی تشریح و توضیح میں کسی قسم کی مصلحت کو رکاوٹ نہیں بننے دیا، اپنے استاد سے بے پناہ محبت اور ادب و احترام کے تعلق کے باوجود جہاں ضروری سمجھا ان سے اجتہادی آراء کی بنیاد پر "اختلاف رائے" کیا۔ یہ "اختلاف رائے" کسی ذاتی عناد یا تعصب یا علمی برتری ثابت کرنے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ ان کی بنیاد سراسر علمی و تحقیقی نوعیت کی تھی۔ ذیل میں چند مثالیں بطور دلائل پیش کی جاتی ہیں جس میں امام صاحب اور آپ کے شاگردوں کے درمیان مختلف مسائل میں علمی اختلافات کیے ہیں۔

وتر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وتر واجب ہیں, جب کہ (صاحبین) امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک وتر سنت کا درجہ رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اپنے مؤقف کی دلیل میں حدیث رسول ﷺ پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ایک زائد کا حکم دیا ہے اور وتر ہیں، فَجَعَلَهَا لَكُمْ فِيمَا بَيْنَ الْعِشَاءِ إِلَى طُلُوعِ الْفَجْرِ[10] جو کہ عشاء اور فجر کے درمیان پڑھی جاتی ہے۔ یہاں

---

[10] ابو داود سلیمان بن الاشعث السجستانی، سنن ابی داود، كِتَاب الصَّلَاةِ، بَابُ اسْتِحْبَابِ الْوِتْرِ، (بیروت: المكتبة العصرية)، ۶۱:۲، حدیث: ۱۴۱۸

امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، لہذا وتر واجب کا درجہ رکھتے ہیں۔ صاحبین کے نزدیک وتر سنت کا درجہ رکھتے ہیں، کیونکہ جس طرح سنت کا تارک کافر نہیں اسی طرح واجب کا تارک بھی کافر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اپنے مؤقف کی دلیل میں حدیث پیش کرتے ہیں، کہ ایک اعرابی کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا: خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي اليَوْمِ وَاللَّيْلَةِ تجھ پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، اعرابی نے کہا: قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ[11] اعرابی نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اسکے علاوہ سب نفل ہیں۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہیں ان کے علاوہ باقی سب نوافل کا درجہ رکھتے ہیں، لہذا وتر بھی انہیں میں شامل ہیں جس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔[12]

اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف وتر کی شرعی حیثیت پر ہے۔ امام صاحب کے نزدیک وتر شرعی طور پر واجب کا درجہ رکھتے ہیں، انہوں نے حدیث رسول ﷺ سے استدلال کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے وتر کی نماز پڑھنے کا حکم دیا اور امر وجوب کے لیے آتا ہے۔ صاحبین نے بھی اپنے استدلال کے لیے حدیث کا سہارا لیا ہے، کہ نماز پنجگانہ کے علاوہ باقی سب عبادت نوافل میں شامل ہوتی ہے۔ دونوں آراء کی روشنی میں سے امام صاحب کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے۔ وتر کی شرعی حیثیت وجوب کی ہے اجماع امت بھی اسی پر ہے البتہ اس کی ادائیگی عشاء اور فجر کے درمیان جب چاہیں کرسکتے ہیں۔ کی جاسکتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زمین کی ہر قسم کی پیداوار پر عشر واجب ہے خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔[13] وہ قرآن کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ "[14] جو ہم نے زمین میں سے تمہارے لیے نکالا ہے (اس میں سے عشر دو)۔ اس کے علاوہ وہ حدیث سے بھی دلیل پیش کرتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَا أَخْرَجَتِ الأَرْضُ مِنْ قَلِيلٍ أَوْ كَثِيرٍ مِنْ شَيْءٍ؛ فَفِيهِ الْعُشْرُ "زمین میں کم زیادہ جو کچھ بھی نکلے اس میں سے عشر واجب ہے۔ صاحبین کے نزدیک عشر اسی صورت میں واجب ہو گا جب اس میں دو شرائط پائی جاتی ہوں۔ جب زمین کی پیداوار پانچ وسق سے کم نہ ہو کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا "لَيْسَ فِيمَا دُونَ

---

[11] بخاری۔ الجامع الصحیح، کِتَابُ الإِيمَانِ ،بَابٌ: الزَّكَاةُ مِنَ الإِسْلاَمِ، ۱: ۱۸، حدیث:۴۶

[12] زیلعی، عثمان بن علی، فخر الدین الحنفی، **تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق**، (قاہرہ: مطبعۃ الکبریٰ الامیریہ بولاق، ۱۳۱۳ھ)، ۱: ۱۶۹

[13] ابو بکر محمد بن احمد السرخسی، **المبسوط**، (بیروت: دار المعرفۃ، ۱۹۹۳ء)، ۳: ۳

[14] البقرہ:۲۶۶

خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ''[15] انچ وسق سے کم مقدار میں صدقہ نہیں ہے۔(ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا اور ایک صاع چار من کا ہوتا تو پانچ وسق بارہ سو من کے ہوتے)۔ دوسری شرط یہ کہ اس پیداوار میں ایک سال تک محفوظ رکھنے کی صلاحیت ہو۔ لوگ اس کا ذخیرہ کر سکیں ایسی سبزیاں جنہیں ذخیرہ نہ کر سکیں مثلاً تربوز، گاجر، ساگ، اور پھول وغیرہ پر عشر نہیں۔ لہذا ان دو شرائط کی موجودگی میں زمین کی پیداوار پر زکوۃ واجب ہوگی۔[16]

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ حنفی میں تقلید محض کی تلقین نہیں کی جاتی بلکہ مدلل و مستحکم رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے تلامذہ نے بعض مسائل میں اپنے استاد سے اتفاق رائے بھی کیا ہے اور بعض مسائل میں مدلل اجتہادی رائے کے ذریعے اختلاف رائے بھی کیا ہے۔ ان اختلافات کی وجہ سے فقہ حنفی میں وسعت پیدا ہوئی اور عوام الناس کے لیے اس پر عمل کرنے میں آسانی پیدا ہوئی۔

متقدمین فقہاء احناف کے درمیان اختلاف رائے:

فقہ حنفی میں امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں نے مسائل کی تشریح و تعبیر میں جن اصول و قوانین کو اپنایا اور جن کی بنیاد پر اجتہادی آراء کا اظہار کرتے ہوئے اختلاف رائے کی روایت کا آغاز کیا، بعد میں آنے والے فقہاء احناف نے بھی اسی روش کو اختیار کرتے ہوئے فقہی مسائل کی تشریح کی۔ ان فقہاء احناف نے امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے تلامذہ کے اقوال کو من و عن قبول کرنے کی بجائے ان اقوال کو عقلی و نقلی دلائل کی بنیاد پر پرکھا، جہاں ضروری سمجھا قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہادی آراء کا بھی اظہار کیا جس کی وجہ سے بعض مسائل میں امام صاحب اور آپ کے تلامذہ کے مؤقف سے اختلاف رائے بھی کیا۔ گویا اختلاف رائے کا جو سلسلہ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں سے شروع ہوا متقدمین فقہاء احناف نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ فقہ حنفی پر تقلید محض کے کیے جانے والے اعتراض کو ان فقہاء احناف نے بھی رد کیا اور اختلاف رائے کے عمل کو آگے بڑھایا۔ متقدمین فقہاء احناف میں جن ائمہ نے مسائل کی تشریح کرتے ہوئے امام صاحب اور آپ کے تلامذہ سے اختلاف رائے کیا ہے ان میں سے امام جصاص، امام طحاوی، امام بدرالدین، اور امام ابن ہمام قابل ذکر ہیں۔ ان ائمہ احناف نے بہت سے مسائل میں اپنی اختلافی آراء کا اظہار کیا ہے مگر بطور نظائر چند مسائل کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

---

[15] بخاری۔ الجامع الصحیح، کِتَابُ الزَّكَاةِ، بَابُ زَكَاةِ الوَرِقِ، ۲: ۱۱۶، حدیث: ۱۴۴۷

[16] یعقوب بن ابرہیم، ابو یوسف، الآثار، (بیروت: دارالکتب العلمیة)، ۶۴

ابو بکر الجصاص کے فقہی اختلافات:

ابو بکر الجصاص کا پورا نام احمد بن علی الرازی ہے، آپ ایران کے شہر "رے" میں 305 ہجری میں پیدا ہوئے[17]۔ آپ فقہ حنفی میں مایہ ناز فقیہہ اور قابل فخر مفسر ہیں۔ جن کی فقہی اور تفسیری خدمات قابل ذکر ہیں، انہوں نے کئی مسائل میں امام صاحب اور صاحبین سے اختلاف رائے کیا ہے اور فقہ حنفی کی اختلاف رائے کی روایت کو بر قرار رکھتے شرعی مسائل وضاحت کی۔ مثلاً صلوٰۃ الخوف کے بارے امام ابو یوسفؒ کا قول ہے:

کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد اب صلوٰۃ الخوف نہیں پڑھی جائے گی۔ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ایک امام کی بجائے دو امام بنائے جائیں گے۔ جو الگ الگ دو جماعت کی صورت میں دو گروہوں کو نماز پڑھائیں گے۔ ان کے مؤقف کی دلیل اس قرآنی آیت کا ظاہری حکم ہے: وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ[18] اور (اے محبوب!) جب آپ ان میں (موجود) ہوں تو ان کے لئے نماز (کی جماعت) قائم کریں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نبی اکرم ﷺ کے لیے آپ ﷺ کی موجودگی میں مخصوص فرمایا ہے۔ اس کو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا ہے کہ ہر شخص کو آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی سعادت وفضیلت نصیب ہو جائے۔ جب کہ بعد میں ایسی صورت حال میں دو اماموں کے ذریعے نماز پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ فضیلت وسعادت کے اعتبار سے دونوں اماموں کے پیچھے پڑھی گئی نماز برابر ہو گی۔ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آنے جانے، قدموں سے چلنے اور قبلہ کی طرف رخ نہ ہونا یہ سب چیزیں نماز کے منافی ہیں، لہٰذا بہتر ہے کہ ایسی صورت حال میں دو اماموں کا انتخاب کیا جائے۔[19]" امام ابو بکر الجصاص امام ابو یوسفؒ سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن کی آیت " وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ میں بے شک خطاب نبی اکرم ﷺ سے کیا گیا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا دائرہ بھی آپ ﷺ تک ہی محدود ہے اور بعد والے اس حکم سے خارج ہیں۔ امام جصاص کہتے ہیں کہ جب ہم نبی اکرم ﷺ کو کوئی عمل کرتے ہوئے دیکھیں تو ہم پر لازم ہے کہ آپ ﷺ کی اتباع کریں۔ اور اتباع کا مطلب بھی یہی ہے کہ جس طرح آپ ﷺ نے عمل کیا ہم پر لازم ہے کہ اسی طرح عمل

---

[17] ابو محمد، عبد القادر بن محمد القرشی، **الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ**، (کراچی: میر محمد کتب خانہ)، ۱: ۸۴

[18] النساء: ۱۰۲

[19] سرخسی، **المبسوط**، ۳: ۳

کریں۔ مزید اپنے مؤقف کے حق میں کہتے ہیں کہ قرآن کا حکم ہے "خذ من اموالهم"[20] کہ ان کے اموال میں سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کریں، تو کیا زکوٰۃ کی وصولی کا حکم صرف آپ ﷺ کی ذات تک محدود ہے اور بعد میں آنے والے ائمہ و مسلمین اس حکم سے خارج ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن میں دیگر کئی مقامات پر ایسے ہی احکامات ہیں جن میں خطاب نبی اکرم ﷺ سے کیا گیا، مگر بعد کے ائمہ و مسلمین نے ان پر عمل کیا۔ مثلا "فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ"[21] پس ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ[22] "اوران کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قرآن کے مطابق فیصلہ کریں اس کے علاوہ صحابہ کرام کی ایک جماعت جن میں حضرت عبد اللہ ابن عباس، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اور حذیفہ رضی اللہ عنھم سے بھی صلوٰۃ الخوف منقول ہے۔[23] اس مسئلہ میں امام ابو بکر الجصاص نے امام ابو یوسفؒ سے اختلاف کیا ہے, جہاں تک امام ابو یوسف کے مؤقف کی بات ہے ان کے استدلال میں سے ایک بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نبی اکرم ﷺ کی امامت میں نماز پڑھنا ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس لیے یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کے لیے ہے کہ " صلوۃ الخوف" کی صورت میں دو گروہ بنا لیے جائیں تا کہ کوئی بھی آپ ﷺ کی امامت سے محروم نہ رہ سکے۔ جہاں تک دوسرا استدلال ہے کہ چونکہ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے لہذا یہ حکم آپ ﷺ کے لیے خاص ہے یہ استدلال کمزور محسوس ہوتا ہے۔ اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو بہت سے احکام سے امت خارج ہو جائے گی لہذا اس دلیل کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات ہمارے لیے باعث اسوہ حسنہ ہے لہذا آپ ﷺ کی اتباع میں وہی عمل کیا جائے جو آپ ﷺ کی سنت ہے۔ صلوۃ الخوف میں بھی آپ ﷺ کی ہی اتباع کی جائے گی اور ایسے نماز ادا کی جائے گی جیسے آپ ﷺ نے ادا کی۔

---

[20] المآئدہ:۴۸

[21] التوبہ:۱۰۳

[22] المآئدہ:۴۹

[23] احمد بن علی ابو بکر جصاص، **شرح مختصر الطحاوی**، (دار البشائر الإسلامیة، ۱۴۳۱ ھ)، ۲: ۱۷۳، ۱۷۰

امام طحاوی کی اختلافی آراء:

ابو بکر الجصاص کے بعد اس دور کے فقہاء احناف میں امام طحاوی کا نام قابل ذکر ہے۔ ابن عساکر نے امام طحاوی کی ولادت ۲۳۹ہجری نقل کی ہے [24] آپ نے علم حدیث میں نمایا خدمات سر انجام دینے کے ساتھ فقہ حنفی کو اوج ثریا کی بلندیوں تک پہنچانے کا کام سر انجام دیا۔ امام طحاوی نے فقہ حنفی کی روایت کو بر قرار رکھتے ہوئے بعض مسائل میں امام صاحب اور آپ کے شاگردوں سے اختلاف رائے بھی کیا ہے۔ بطور مثال ذیل میں پیش کرتے ہیں کہ امام طحاوی کس طرح اپنے استدلال کی بنیاد پر مسائل کو واضح کرتے ہیں۔

نماز استسقاء کے مسئلہ میں امام طحاوی نے امام ابو حنیفہ ؒ سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ ؒ کا مؤقف ہے "لَا صَلَاةَ فِي الِاسْتِسْقَاءِ، وَإِنَّمَا فِيهِ الدُّعَاءُ" [25] استسقاء مستقل نماز کا نام نہیں بلکہ کبھی فقط دعا ہے۔ حدیث سے اپنے مؤقف کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی جمعہ کے دن مسجد میں اس دروازے سے داخل ہوا جو ممبر رسول ﷺ کے سامنے تھا۔ اور نبی اکرم ﷺ کی بار گاہ میں جا کر عرض کرنے لگا یا رسول اللہ ﷺ مال تباہ ہو گیا، جانور بھوک کی وجہ سے سواری کے قابل نہ رہے۔ پس آپ ﷺ اللہ سے بارش کی دعا فرمائیں۔ پس آپ ﷺ نے اس وقت ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا کی "اے اللہ ہمیں رحمت کی بارش سے سیر اب فرما۔ حضرت انس بن مالک ؓ کہتے ہیں: اللہ کی قسم آسمان پر کوئی بارش کا ٹکڑا نہیں تھا تو اچانک سلع (سلع مدینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے جو مدینہ منورہ کے مغرب کی جانب ۵۰۰ میٹر کی دوری پر واقع ہے۔) کی پچھلی جانب سے ایک بادل ٹکڑا نمودار ہوا اور دیکھتے ہی پھیل گیا اور برسنے لگا یہاں تک کہ ایک ہفتہ تک ہم نے دھوپ کو نہیں دیکھا۔ [26] اس روایت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بارش کے لیے باقاعدہ نماز نہیں پڑھی گئی بلکہ فقط دعا پر ہی اکتفا کیا ہے، اسی روایت کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ ؒ اپنا مؤقف قائم کرتے ہیں۔ مگر امام طحاوی تبصرہ کرتے ہو ئے کہتے ہیں کہ اس روایت میں نماز کا ذکر نہ ہونا اور فقط دعا کا ذکر ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ نماز مسنون نہیں کیو نکہ دیگر روایات میں نماز کا تذکرہ موجود ہے۔

---

[24] ابن عساكر ،أبو القاسم علي بن الحسن، **تاريخ دمشق**،(دار الفكر للطباعة والنشر،۱۹۹۵ء)،**۵: ۳۶۸**

[25] علاء الدين ابو بكر بن مسعود كاسانى، **بدائع الصنائع**،(دار الكتب العلمية، **۱۹۸۶ء**)،**۱: ۲۸۶**

[26] بخاری۔ **الجامع الصحیح**، كِتَابُ الجُمُعَةِ،بَابُ رَفْعِ النَّاسِ أَيْدِيَهُمْ مَعَ الإِمَامِ فِي الِاسْتِسْقَاءِ،۲:۳۱،حدیث:۱۰۲۹

اس کے علاوہ امام طحاوی کہتے ہیں کہ نماز استسقاء مسنون ہے، جس میں خطبہ اور تحویل ردا جیسے امور شامل ہیں۔ امام طحاوی کہتے ہیں امام دو رکعت پڑھائے گا اور ان میں قرآت بالجہر کرے گا، پھر خطبہ اور تحویل رداء ہوگی، چادر کے اوپر والے حصے کو نیچے اور نیچے والے حصے کو اوپر بدل دیا جائے گا اگر ایسا مشکل ہو دائیں ہاتھ کو بائیں اور بائیں ہاتھ کو دائیں طرف بدل لیا جائے گا۔ امام طحاوی اپنی رائے کے ثبوت میں حضرت عبد اللہ بن زید کی روایت پیش کرتے کہ نبی اکرم ﷺ عید گاہ کی طرف گئے پس آپ ﷺ نے دعا یا نماز پڑھی اور تحویل رداء فرمائی اور قبلہ کی طرف رخ کیا۔[27]

اس روایت میں دعا کے ساتھ تحویل ردا کا بھی تذکرہ پایا جاتا۔ قلب ردا اول تو اوپر سے نیچے کی طرف کی جائے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو دائیں بائیں کر لی جائے۔ اس کے علاوہ امام طحاوی نے ایسی روایات کا ذکر کیا ہے جن میں با قاعدہ نماز میں قرات کا بھی ذکر ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس روایت کرتے ہیں نبی اکرم ﷺ پرانے کپڑوں میں تواضع و تضرع کے ساتھ عید گاہ میں آئے اور تمھاری طرح خطبہ نہیں دیا بلکہ دعا کرتے رہے اور گڑ گڑاتے رہے اور اللہ کی بڑائی بیان کرتے رہے پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی جیسے عید کی نماز ہوتی ہے۔[28]

امام طحاوی کہتے ہیں کہ "کما یصلی فی العیدین" یہ جملہ اپنے اندر دو احتمال رکھتا ہے۔ عیدین کے ساتھ تشبیہ دینے کا مطلب ہے کہ قرات بالجہر بھی ہو سکتی ہے اور زائد تکبیرات بھی ہو سکتی ہیں اور اس کے علاوہ خطبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس روایت کو بطور حوالہ پیش کرنے کے بعد امام طحاوی کہتے ہیں ہم نے عبادات میں جمعہ اور عیدین کو پایا ہے۔ جن میں خطبہ دیا جاتا ہے جمعہ کا خطبہ قبل از نماز ہوتا ہے جب کہ عیدین کا خطبہ نماز کے بعد ہوتا ہے۔ لہذا عیدین کا خطبہ استسقاء کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے کیونکہ عیدین کا خطبہ مسنون ہے عید کی نماز اس کے بغیر بھی ہو جاتی ہے، لہذا استسقاء کے ساتھ زیادہ مشابہت خطبہ عید ہی ہوتی ہے۔[29]

فقہاء احناف ہر مسئلہ کو مختلف پہلوؤں سے دیکھتے ہیں اس پر عقلی و نقلی استدلال پیش کرتے ہیں اور پھر کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہیں اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ نے ایک حدیث سے اپنی رائے کو اخذ کیا۔ ان کا یہ مؤقف ہے کہ اگر

---

[27] طحاوی، ابو جعفر احمد بن عمر، شرح معانی الآثار، **کتاب الصلوٰۃ**، باب الاستسقاء، (عالم الکتب، ۱۹۹۴ء)، ۱: ۳۲۵، حدیث: ۱۹۰۶

[28] ابو داود سلیمان بن الاشعث السجستانی، سنن ابی داود، کِتَاب الصَّلَاةِ، جُمَّاعُ أَبْوَابِ صَلَاةِ الِاسْتِسْقَاءِ وَتَفْرِيعِهَا، (**بیروت**: المکتبۃ العصریۃ)، ۱: ۳۰۲، حدیث: ۱۱۶۵

[29] طحاوی ، شرح معاني الآثار۔ كِتَابُ الصَّلَاةِ ،بَابُ الِاسْتِسْقَاءِ كَيْفَ هُوَ، ۱: ۳۲۵، حدیث: ۱۹۰۶

نماز استسقاء کے لیے نماز ضروری ہوتی تو آپ ﷺ اعرابی کے سوال پر باقاعدہ نماز پڑھتے اور پھر بارش کے لیے دعا فرماتے جبکہ آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا اور ممبر پر بیٹھے ہی اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا لیے۔لہذا امام صاحب کے نزدیک بارش کے لیے نماز ضروری نہیں ویسے بھی دعا کی جاسکتی ہے۔اسی مسئلہ امام طحاوی اپنا الگ مؤقف پیش کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ سے اختلاف رائے کرتے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

بدرالدین عینی اور اختلافات رائے:

علامہ بدرالدین عینی ۷۶۲ھ بمطابق ۱۳۶۱ء,۲۶ کو پیدا ہوئے[30] بدرالدین عینی نے بھی مختلف مسائل کی تشریح کرتے ہوئے اجتہادی رائے کا اظہار کیا ہے۔بہت سے فقہی مسائل ایسے ہیں جن میں آپ نے دیگر فقہاء احناف سے اختلاف رائے کیا ہے اور بعض مسائل اتفاق رائے بھی کیا ہے۔گویا فقہ حنفی میں رہتے ہوئے مسائل کو آزادانہ انداز میں قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کیا ہے۔آپ کے فقہی اختلافات بہت زیادہ ہیں مگر بطور دلیل ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

مثلاً: قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنا جائز ہے یا نہیں اس کی طرف پیٹھ کرکے بیٹھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس کے متعلق ائمہ احناف کی مختلف آراء ہیں۔اس بات پر سب کا اتفاق ہے قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا منع ہے خواہ صحرا میں ہو یا کسی غسل خانہ میں۔امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا منع ہے البتہ دبر کرکے بیٹھا جا سکتا ہے۔ابن عابدین امام صاحب کا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ وَرُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّهُ يَحِلُّ[31] اس رائے کی دلیل میں حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف پیٹھ کرکے شام کی طرف منہ کرکے بیٹھے ہوئے دیکھا۔[32] اس حدیث بطور دلیل بناکر امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں قبلہ کی طرف دبر کرکے بیٹھنے میں حرج نہیں۔علامہ بدرالدین عینی ااپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ کرنا یا پیٹھ کرکے بیٹھنا جائز نہیں، خواہ صحرا میں ہو یا کسی عمارت یعنی غسل خانے میں ہو۔اپنے موقف کی حمایت میں احادیث کو بطور

---

[30] عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد ،(تخریج)عبد اللہ محمود محمد عمر، **عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری**، (بیروت: لبنان دارالکتب العلمیہ)،۱: ۵

[31] ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز، **رد المحتار علی الدر المختار**، (بیروت: دار الفکر، ۱۹۹۲ء)،۱: ۳۴۱

[32] بخاری، **الجامع الصحیح**، كِتَابُ الوُضُوءِ، بَابُ مَنْ تَبَرَّزَ عَلَى لَبِنَتَيْنِ، ۱: ۴۱، حدیث : ۱۴۵

دلیل پیش کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ " إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الغَائِطَ، فَلاَ يَسْتَقْبِلِ القِبْلَةَ وَلاَ يُوَلِّهَا ظَهْرَهُ،[33] جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤتو نہ قبلہ کی طرف پیٹھ کرو اور نہ ہی منہ کر کے بیٹھو۔

اسی طرح حضرت ابو ایوب انصاری کی دوسری روایت ہے کہ فَقَدِمْنَا الشَّامَ، فَوَجَدْنَا مَرَاحِيضَ قَدْ بُنِيَتْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ، فَكُنَّا نَنْحَرِفُ عَنْهَا وَنَسْتَغْفِرُ اللَّهَ"[34]

ان روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھنا منع ہے۔ یہاں کعبہ کی طرف مطلقا منہ کرنے سے منع کیا گیا ہے خواہ صحرا میں ہو یا کسی دیوا کے اندر یعنی غسل خانہ میں موجود ہو یعنی اس کی ممانعت دیوار کے پیچھے اور صحرا دونوں میں ایک ہی طرح ہے۔ جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ دیوار کے پیچھے بیٹھ کر قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھنا جائز ہے۔ علامہ عینی ان کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں اگر تو اس کو اس وجہ سے جائز کہا جا رہا ہے کہ کسی غسل خانے میں بیٹھا ہو تو درمیان دیواریں آ جاتی ہیں تو اس طرح اگر کسی صحرا میں بیٹھا ہو تو اس کے اور کعبہ کے درمیان پہاڑ اور اشجار اور بہت زیادہ چیزیں آ جاتی ہیں، جو آدمی اور قبلہ کے درمیان رکاوٹ حائل کرتیں ہیں۔لہذا یہ ان کے نزدیک یہ استدلال کمزور ہے۔ جہان تک حدیث کا تعلق ہے تو اس میں عموم پایا جاتا ہے کسی چیز میں تخصیص نہیں پائی جاتی۔ جیسے صحرا میں بیٹھنے کا حکم ہوا ہے اسی طرح دیوار کے اندر بھی وہی حکم دیا گیا ہے۔

چوتھا موقف ہے کہ کسی صحرا میں تو کعبہ طرف منہ کرنا اور پیٹھ کرنا ناجائز ہے جبکہ عمارت میں پیٹھ کر کے بیٹھنا جائز ہے۔ الغرض علامہ بدر الدین عینی کی رائے کے مطابق احادیث کی روشنی میں مطلقا منع کیا گیا ہے کوئی تخصیص نہیں بلکہ عموم پایا جاتا ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی جائز ہے اور نہ ہی پیٹھ کرنا، جس طرح صحرا میں ممانعت ہے اسی طرح دیوار کے پیچھے بھی ممانعت ہے۔[35]

---

[33] ایضاً ،۱: ۴۱،حدیث:۱۴۴

[34] ابو داود، سنن ابی داوَد، كِتَاب الطَّهَارَةِ، بَابُ كَرَاهِيَةِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ عِنْدَ قَضَاءِ الْحَاجَةِ،۱: ۳،حدیث:۹

[35] عینی،عمدة القاري شرح صحيح البخاري،۲: ۲۷۶-۲۷۹

ابن الہمام کے فقہی اختلافات:

متقدمین فقہاء احناف میں ابن الہمام کا نام سر فہرت ہے انہوں نے فقہ حنفی کو عوام الناس کے سامنے آسان پیرائے میں بیان کیا۔ ابن ہمام کی پیدائش ۷۹۰ھ بمطابق ۱۳۸۸ء اسکندریہ میں ہوئی۔[36] ابن الہمام نے فتح القدیر مانہ ناز کتاب لکھی، جس میں انہوں نے نہ صرف فقہ حنفی کے مسائل کی وضاحت کی بلکہ جہاں ضرورت محسوس کی امام ابوحنیفہ اور آپ کے شاگردوں سے علمی و تحقیقی اختلاف رائے بھی کیا ہے۔ امام ابن الہمام نے اختلاف رائے کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ابوحنیفہؒ اور آپ کے تلامذہ سے کچھ مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ ان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ کو بطور دلیل پیش کی جاتی ہے۔ وضو میں مسواک کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے شاگردوں کی رائے ہے کہ مسواک کرنے کی شرعی حیثیت مسنون ہے یعنی وضو میں مسواک کرنا سنت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس امام ابن الہمام کا مؤقف ہے کہ مسواک کرنا مستحب عمل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اپنی را ئے پر دلیل دیتے ہوئے احادیث پیش کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ[37] اگر میری امت پر مشکل نہ ہوتی تو میں ان کو ہر نماز کے ساتھ مسواک کا حکم دیتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَرْقُدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ، فَيَسْتَيْقِظُ إِلَّا تَسَوَّكَ قَبْلَ أَنْ يَتَوَضَّأَ-[38] بے شک نبی اکرم ﷺ جب رات یا دن کو سو کر اٹھتے تو وضو سے پہلے مسواک کرتے۔ اس طرح اپنے مؤقف کی حمایت میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں۔ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ۔[39]

---

36 سخاوی، ابوالخیر محمد بن عبدالرحمن، **الضوء اللامع لأهل القرن التاسع**، (بیروت: منشورات دار مكتبة الحياة)، ۸: ۱۲۷

37 مسلم بن الحجاج ابو الحسن نیشاپوری، صحیح المسلم، **کتاب الطھارہ**، باب السواک، (بیروت: دار إحیاء التراث العرب)، ۱: ۲۲۰ حدیث: ۲۵۲

38 ابو داود، سنن ابی داؤد، **کتاب الطھارہ**، باب السواک لمن قام من الیل، ۱: ۱۵، حدیث: ۵۷

39 ابو داود، سنن ابی داؤد، **کتاب الطھارہ**، باب السواک لمن قام من الیل، ۱: ۱۵، حدیث: ۵۵

انبیاء کی سنن میں سے ہیں، حیاء، عطر، مسواک اور نکاح ان دلائل کی بنیاد پر امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ وضو میں مسواک کرنا شرعا سنت کی ساتھ دانتوں کو مانجھتے تھے۔ اس عمل پر آپ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے مداومت اختیار کی ہے لہذا یہ سنت کا فائدہ دیتا ہے۔[40]

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:" أَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ المرْسَلِينَ: الحيَاءُ، وَالتَّعَطُّرُ، وَالسِّوَاكُ، وَالنِّكَاحُ "[41] چار چیزیں ابن الہام کہتے ہیں کہ وضو میں مسواک کرنا مستحب ہے کیونکہ مذکورہ روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: فَضْلُ الصَّلَاةِ بِالسِّوَاكِ، عَلَى الصَّلَاةِ بِغَيْرِ سِوَاكٍ، سَبْعِينَ ضِعْفًا ۔ مسواک کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز بغیر مسواک کے پڑھی جانے والی نماز سے ستر گناہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔[42]

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام ابن الہام کہتے ہیں کہ مسواک کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کی اہمیت بیان کی گئی،۔ اس روایت میں مسواک کی افضلیت کو بیان کیا ہے، ابن ہمام اس سے استدلال کرتے ہیں کہ مسواک کرنے کا عمل مستحب کہلائے گا۔ اس کے علاوہ امام ابن ہمام کہتے ہیں کہ مسواک صرف وضو میں ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ پانچ مختلف مواقعوں پر کرنا مستحب ۔ ہے۔ اصْفِرَارُ السِّنِّ، وَتَغَيُّرُ الرَّائِحَةِ، وَالْقِيَامُ مِنْ النَّوْمِ، وَالْقِيَامُ إِلَى الصَّلَاةِ، وَعِنْدَ الْوُضُوءِ۔ جس طرح ان پانچ مواقعوں پر مسواک کا حکم ہے اسی طرح وضو میں بھی اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے ۔[43] اس مسئلہ میں دونوں حضرات نے مضبوط استدلال پیش کیا ہے، لیکن ان دونوں آراء کی روشنی میں مسواک جیسے اہم مسئلہ میں تطبیق کی جا سکتی ہے کہ مسواک کو سنت غیر مؤکدہ کا درجہ دیا جائے۔ چونکہ نبی اکرم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کی بہت زیادہ اہمیت بیان فرمائی ہے لہذا فقط اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دوسری طرف آپ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس پر سختی نہیں فرمائی جس کی وجہ سے اسے

---

[40] محمد بن عیسی ترمذی ،سنن الترمذي، **کتاب النکاح**، باب ماجآء في فضل التزويج، (مصر: شركة مكتبة ومكتبه مصطفى البانی، ۱۹۷۵ء)، ۳:۳۸۳، حدیث: ۱۰۸۰

[41] مرغيناني، علي بن ابي بكر ابو الحسن، **الهدايہ**، (لبنان، بیروت: دار احياء التراث العربي)، ا: ۱۵

[42] احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ الشیبانی، **مسند امام احمد بن حنبل**، (مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۱ء)، ۴۳: ۳۶۱، حدیث: ۲۶۳۴۰

[43] ابن ہمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد، **فتح القدیر** ، دار الفکر، ا: ۲۵

واجب یا سنت مؤکدہ قرار دینا بھی امت کیے مشکل میں ڈالنے کے مترادف ہو گا۔ خلاصہ بحث: اس آرٹیکل میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین اور اس کا ارتقا آزادانہ ماحول میں ہوا، جس میں امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے تلامذہ سمیت ہر دور کے ائمہ احناف نے مسائل کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے آزادانہ ماحول میں عقلی و نقلی دلائل کی بنیاد پر اجتہادی آراء کا اظہار کیا ہے، جس کی وجہ سے فقہاء احناف میں بہت سے مسائل میں اختلاف رائے بھی پایا گیا ہے۔ یہ اختلاف رائے کسی ذاتی منفعت یا تعصب پر مبنی نہیں بلکہ خالصتاً علمی و تحقیقی بنیادوں پر قائم ہے۔ جس سے اس بات کا بھی جواب مل جاتا ہے کہ فقہ حنفی میں تقلید محض پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ مدلل اجتہادی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے، اگرچہ وہ رائے امام صاحب یا آپ کے شاگردوں کی آراء سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ فقہ حنفی میں اگر امام ابو حنیفہ سے فقہاء نے علمی و تحقیقی بنیادوں پر اختلاف کیا گیا ہے تو اس بڑھ کر اظہار رائے کی آزادی کی دلیل کیا ہو سکتی ہے۔ گویا فقہ حنفی میں تقلید محض کا اعتراض بالکل بے جا اور من گھڑت ہے کیونکہ اس فقہ میں شخصیت کی بجائے ہمیشہ مدلل رائے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آرٹیکل میں فقہ حنفی کے آغاز سے 800 ہجری تک کے فقہاء احناف کا انتخاب کیا گیا ہے، اور ان فقہاء کے اختلافی مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔